# رسائل و مسائل

## نکاحِ فاسد و نکاحِ باطل

**سوال:** "ایک صاحب نے ایک مسئلہ بیان کیا ہے جو بظاہر عجیب و غریب اور صریحاً غلط معلوم ہوتا ہے۔ مسئلہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ جن عورتوں سے نکاح شرعاً ناجائز ہے، ان سے بھی اگر طرفین کی رضا سے ایجاب و قبول اور شہادت و مہر کے ساتھ عقد ہو جائے تو ایسا نکاح واقع اور منعقد ہو جائے گا، گو فاسد ہو گا۔ لیکن اولاد حرامی نہ ہو گی، نہ حدِ زنا جاری ہو گی، نہ بلا طلاق ایسا نکاح زائل ہو گا اور نہ دوسرے مرد سے عورت کا نکاح منعقد ہو سکے گا۔ جب ان سے اس مسئلے کی تائید میں کوئی سند یا حوالہ طلب کیا گیا تو کہنے لگے کہ یہ ایک عام فقہی مسئلہ ہے جو حنفی مسلک میں مسلّمہ ہے۔ جس سے چاہو دریافت کر لو۔ براہِ کرم واضح کریں کہ آیا واقعی یہ مسئلہ یوں ہی ہے اور ہے تو کس کتاب میں ہے؟ مناسب ہو تو جواب ترجمان میں دیں۔"

**جواب:** اصل سوال کا جواب دینے سے پہلے اس امر کی جانب اشارہ کر دینا موزوں ہے کہ کوئی فقہی مسئلہ خواہ بجائے خود درست اور کسی کتاب میں مذکور ہی کیوں نہ ہو، اسے بلا ضرورت عوام الناس کے سامنے اس طرح بیان کر دینا ذمہ دار اور محتاط اصحاب کا شیوہ نہیں ہے جس سے کہ لوگ غلط فہمیوں اور الجھنوں میں مبتلا ہوں، ان میں گناہ کی جسارت پیدا ہو یا ان میں فقہاء و علماء کے بارے میں سوئے ظن پیدا ہو۔ اسی طرح اگر کسی مسئلے کے تفصیلی پہلوؤں کو واضح کیے بغیر اس کا ایک مجمل خلاصہ عام لوگوں تک پہنچا دیا جائے تو یہ بھی شدید فتنہ انگیزی کا موجب ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں کوئی ایک ہی فقہی مسلک یا گروہ بدنام نہیں ہوتا، بلکہ جہالت و انحراف کے موجودہ

دور میں اس سے دین اور اہلِ دین کی بحیثیتِ مجموعی سُبکی ہوتی ہے اور فقط ان لوگوں کے ہاتھ مضبوط ہوتے ہیں جو چند فقہی جزئیات یا چند روایات کی آڑ میں ہمارے پورے دینی و علمی ورثے پر خطِ نسخ پھیر دینا چاہتے ہیں اور اسلاف کی پوری جماعت کے خلاف عدمِ اعتماد کی تحریک اور مذمت کی قرارداد پاس کرنا چاہتے ہیں۔

جہاں تک اصل مسئلے کا تعلق ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ اصولی طور پر ائمہ و فقہاء صرف اس نکاح کو صحیح اور جائز قرار دیتے ہیں جس کے انعقاد میں کوئی شرعی مانع نہ ہو اور جس کے شرائط و ارکان میں سے کوئی رکن یا شرط غائب نہ ہو۔ لیکن جس نکاح کے انعقاد میں شرعاً کوئی امر مانع ہو یا جس کے ارکان میں سے کوئی رُکن غیر موجود ہو، اُسے فقہاء غیر صحیح قرار دیتے ہیں۔ متاخرین فقہائے حنفیہ نے البتہ عبادات و معاملات کی غیر صحیح صورتوں میں مزید امتیاز قائم کرتے ہوئے ان کی دو ذیلی قسمیں بیان کی ہیں، ایک باطل، دوسری فاسد۔ چنانچہ نکاح کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے نکاح باطل سے مراد وہ نکاح لیا ہے جس کا عدم و وجود بالکل یکساں ہو، جو قطعی طور پر کالعدم اور غیر موثر ہو اور جس کے صریح البطلان ہونے میں فقہاء کے مابین کوئی اختلاف نہ ہو۔ مثال اس کی یہ ہے کہ جیسے کوئی بدبخت محرمات یعنی محرم عورتوں سے نکاح کرے یا دو بہنوں سے ایک وقت میں نکاح کرے یا کسی ایسی عورت سے نکاح کرے جو دوسرے کی منکوحہ ہو یا عدت گزار رہی ہو اور اس شخص کو اس بات کا علم ہو کہ عورت منکوحہ یا معتدہ ہے۔ اس طرح کا نکاح جس طرح دوسرے فقہاء کے نزدیک باطل ہے، اسی طرح احناف کے نزدیک بھی باطل اور معدوم محض ہے۔ ان کے نزدیک بھی اس طرح کے نکاح کا واقع یا منعقد ہونا تو درکنار، اس پر حد زنا لازم آتی ہے اور اسے بے اثر اور ناجائز قرار دینے کے لیے کسی طلاق، متارکہ یا تفریق و تفسیخ کی حاجت نہیں۔ یہ آپ سے آپ کالعدم VOID ہے۔ اس پر نہ عدت واجب ہوتی ہے اور نہ اس سے پیدا شدہ اولاد صحیح النسب قرار دی جا سکتی ہے۔ حنفی قانون کی نگاہ میں بھی ایسے باطل نکاح اور زنا

میں قطعاً کوئی فرق نہیں۔

غیر صحیح نکاح کی دوسری قسم حنفیہ کے ہاں نکاحِ فاسد ہے اور اس سے ان کی مراد ایسا نکاح ہے جس کا جواز و عدمِ جواز یا انعقاد و عدمِ انعقاد مشتبہ یا فقہاء کے مابین مختلف فیہ ہو یا جس کی شرائطِ صحت میں سے کوئی شرط ناقص یا غائب ہو، اور اس بنا پر وہ نکاح شرعاً قابلِ فسخ ہو۔ مثال کے طور پر ایک عورت عدت گزار رہی ہو لیکن نکاح کرنے والے کو اس کا علم نہ ہو یا وہ غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے کہ عدت گزر چکی ہے اور وہ اس عورت سے نکاح کرلے یا مثلاً نکاح کے وقت دو مسلمان عاقل اور بالغ گواہوں کے بجائے صرف ایک گواہ موجود ہو۔ اس طرح کے حالات میں نکاح باطل اور بالکل کالعدم تو نہیں ہوگا لیکن فاسد اور قابلِ فسخ DEFECTIVE OR VOIDABLE ہوگا۔ ایسے نکاح پر حدِ زنا واجب نہ ہوگی اور اسے غیر مؤثر قرار دینے کے لیے مرد کی طرف سے طلاق یا مرد اور عورت دونوں میں سے کسی ایک کی طرف سے اعلانِ متارکہ و تفسیخ ضروری ہوگا، جس کی صورت یہ ہے کہ ایک فریق دوسرے سے کہے کہ "میرا تجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے یا میں نے نکاح فسخ کر دیا۔" اگر فریقین جدائی اختیار کرنے میں لیت و لعل کریں تو قاضیٔ شرع پر لازم ہے کہ وہ دونوں کے درمیان تفریق کر دے۔ اس طرح کے نکاحِ فاسد کے بعد حنفیہ کے نزدیک عدت ضروری ہے اور اس کے نتیجے میں اگر اولاد پیدا ہو تو وہ جائز شمار ہوگی۔

نکاح باطل اور نکاح فاسد کے مابین یہ قانونی فرق جو حنفیہ نے ملحوظ رکھا ہے، اُسے کتبِ عامۂ فقہیہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ رد المحتار، کتاب النکاح میں علامہ ابن عابدین شامی نکاح فاسد کی یہ تعریف نقل کرتے ہیں:۔

هو الذی فقد شرطاً من شرائط الصحة کشهود۔

(نکاحِ فاسد) وہ ہے جس کے صحیح ہونے کی کوئی شرط مثلاً شہادت غیر موجود ہو۔

پھر نکاح باطل کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

والظاهر ان المراد بالباطل ما وجوده كعدمه ولذا لا يثبت النسب ولا العدة في نكاح المحارم۔

ظاہر ہے کہ نکاح باطل سے مراد وہ نکاح ہے جس کا عدم و وجود برابر ہو۔ اور اسی وجہ سے نکاح محارم سے نسب ثابت نہیں ہوتا اور نہ عدت لازم آتی ہے۔

آگے چل کر علامہ موصوف نے بیان کیا ہے کہ اسی طرح جان بوجھ کر منکوحۂ غیر یا عدّت گزارنے والی عورت سے بھی نکاح باطل ہے جو اصلاً منعقد ہی نہیں ہوتا۔ اس میں اور زنا میں کوئی فرق نہیں اور اس کی وہی سزا ہے جو سزا زنا کی ہے۔

اس پوری تفصیل کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر اس مسئلہ منقولہ پر دوبارہ نگاہ ڈالی جائے جو سوال میں فقہائے حنفیہ کی جانب منسوب کیا گیا ہے، تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی حیثیت ایک بے بنیاد الزام سے زاید کی نہیں ہے، جو دانستہ یا نادانستہ احناف کے سر تھوپنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس معاملے میں اگر کوئی صاحب حنفی مسلک بیان کرنے کا ایسا ہی شوق رکھتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ پہلے وہ پوری تفصیل و تشریح سے باخبر ہوں، اس مسلک کو صحیح طور پر نقل کریں اور نکاح کے جواز و عدم جواز کو زیر بحث لاتے ہوئے نکاح باطل اور نکاح فاسد کے مابین جو تفریق حنفیہ نے قائم کی ہے، اُسے بالخصوص پوری طرح واضح کریں۔ ورنہ مجمل بات بتا کر رہ جانے یا دونوں اقسام نکاح کو خلط ملط کر دینے سے ایک عام سامع کے ذہن پر بالکل غلط تاثر پڑے گا اور وہ یہ سمجھ بیٹھے گا کہ بعض فقہاء نے جائز ناجائز کی تمیز کو بالکل اٹھا دیا ہے، حالانکہ حاشا وکلّا وہ اس تہمت سے بری الذمہ ہیں۔ نکاحِ باطل یا نکاحِ فاسد ان کے نزدیک نکاح کی کوئی جائز یا صحیح صورت نہیں ہے، بلکہ یہ دونوں غیر صحیح صورتیں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مقدم الذکر محتاجِ تفسیخ نہیں اور اس پر حدِ زنا واجب ہے۔ موخر الذکر میں تفریق یا مفارقت کا اعلان لازم ہے اور اس پر زنا کی سزا نہیں دی جائے گی، البتہ جُرم کی

نوعیت کو دیکھ کر کوئی دوسری کمتر درجے کی سزا دی جا سکتی ہے۔

---

# سیاہ خضاب کا جواز و عدمِ جواز

**سوال:** کیا از روئے شریعت خضاب لگانے یا اس قسم کی دوسری چیزوں سے ڈاڑھی یا سر کے بالوں کو رنگنا جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو اس کی شرعی دلیل کیا ہے اور اگر ناجائز ہے تو اس کی دلیل کیا ہے۔ ہمارے ہاں اس کے جائز یا ناجائز ہونے پر بحث ہو رہی ہے آپ بھی اپنی رائے کا اظہار فرما دیں۔

**جواب:** مختصر جواب یہ ہے کہ اس بارے میں علمائے امت کا اتفاق ہے کہ سیاہ رنگ کے ماسوا دوسرے رنگ سے اپنے بالوں کو رنگنے میں شرعاً مضایقہ نہیں ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواز کی صراحت فرما دی ہے۔ البتہ سیاہ رنگ کے خضاب کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ خضاب کے معاملے میں امام مسلم وغیرہ کی صحیح ترین حدیث وہ ہے جس میں حضرت ابوبکر کے والد ابوقحافہ کے بارے میں یہ ارشاد نبوی منقول ہے کہ ان کے بالوں کو رنگ دو مگر سیاہ رنگ سے اجتناب کرو۔ خضاب سے متعلق بعض دوسری احادیث بھی مروی ہیں مگر سند کے اعتبار سے ان کا درجہ حدیث مذکور کے برابر نہیں ہے، نیز ان کے مضامین بھی باہم متعارض ہیں۔

بعض میں سیاہ خضاب کے خلاف سخت وعید ہے اور بعض (مثلاً ابن ماجہ، کتاب اللباس کی ایک حدیث) سے سیاہ خضاب کے جواز پر بھی دلالت ہوتی ہے۔

جہاں تک مسلم کی حدیث کا تعلق ہے اس میں اگر نہی کو تحریم کے بجائے مبالغت نہی پر محمول کیا جائے تو ابن ماجہ والی حدیث سے اس کا تعارض رفع ہو جاتا ہے۔ اس تاویل و تطبیق کے لیے حدیث مسلم میں ایک قرینہ بھی موجود ہے اور وہ یہ کہ بالوں کو رنگنے کا حکم بھی وجوب و تاکید کے بجائے محض استحباب پر دلالت کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر بالوں کو سفید

رکھنے میں بھی کراہت تحریمی لازم آتی ہے، جس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔

ائمہ و فقہاء کا ایک گروہ ایسا ہے جو سیاہ خضاب کو مکروہ تحریمی قرار دیتا ہے اور اس سے بچنے کی تاکید کرتا ہے، دوسرا گروہ ایسا بھی ہے جو اس کی کراہت کو محض تنزیہی قرار دیتا ہے اور اس سے اجتناب کو واجب و لازم نہیں سمجھتا۔ مشہور محدث امام زہری سیاہ خضاب کے جواز کے قائل تھے اور اسے استعمال کرتے تھے۔

بہرکیف سیاہ خضاب کے معاملے میں چونکہ اختلاف سلف سے منقول ہے اور طرفین کے استدلال کی بنا تعبیرِ روایات پر قائم ہے، اس لیے اس میں زیادہ شدت اور بحثا بحثی کا طریقہ اختیار کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

---

## مسئلۂ تقدیر

سوال: ایک شخص نے ایک عجیب اعتراض پیدا کیا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مذہب کی تعلیمات کے مطابق ہر شخص کی موت کا وقت معین ہے۔ اس میں کسی قسم کی تاخیر و تقدیم نہیں ہو سکتی۔ لیکن دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اقوامِ مغرب نے حفظانِ صحت کے اصولوں کی پابندی اور بیماریوں کی روک تھام کر کے اپنی عمروں کے اوسط میں اضافہ اور شرحِ اموات میں کمی کر لی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عمر کا بڑھانا گھٹانا اور موت کو ٹالنا انسان کے بس میں ہے۔ اس بات کو واضح کریں کہ ان دونوں باتوں میں سے کونسی بات صحیح ہے۔ آیا زندگی کی مدت اور موت کی گھڑی مقرر ہے یا اس میں ردّ و بدل انسان کے بس میں ہے؟

جواب: آپ نے جو سوال کیا ہے وہ دراصل ایک بڑے اور بنیادی سوال کا جزو ہے۔ وہ بنیادی سوال یہ ہے کہ انسان کس حد تک تقدیر اور مشیتِ الٰہی کے تحت مجبور اور بے بس ہے اور کس حد تک اُسے ارادہ و عمل کی آزادی دی گئی ہے اور کوشش سے نتائجِ مطلوب پیدا کرنا

کس حد تک اس کے امکان میں ہے؟ یہ سوال ایسا نہیں ہے جس کا جواب آسانی اور اختصار کے ساتھ اثبات یا نفی کی صورت میں دیا جا سکے۔ اگر جواب میں یہ کہا جائے کہ انسان اپنی تقدیر کا خالق خود ہے اور کوئی بالاتر طاقت اس کے افعال اور نتائجِ افعال پر حاوی و مؤثر نہیں ہے تو یہ بات بالبداہت غلط ہے۔ انسان جب اپنے آپ کو وجود میں نہیں لا سکتا تو جو اعمال اس کے وجود سے صادر ہوتے ہیں، ان کا فاعلِ مختار آخر وہ کیسے ہو سکتا ہے؟ پھر اگر یہ کہا جائے کہ انسان مجبورِ محض ہے اور اختیار و آزادی سے قطعی محروم ہے تو یہ بات بھی صریحاً غلط اور خلافِ عقل و مشاہدہ ہے اور یہ دین کی تعلیمات کے بھی خلاف ہے۔

حقیقت اِن دونوں انتہاؤں کے بین بین ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک خاص پہلو سے اور ایک خاص دائرے کے اندر انسانوں کو ایک حد تک آزادی حاصل ہے اور یہ آزادی انسان اور پوری کائنات کے خالق ہی کی عطا کردہ ہے۔ لیکن اس دائرے سے باہر جا کر انسان کی آزادی ختم ہو جاتی ہے اور اس کے سارے اعمال اور ان کے نتائج آخر کار مشیتِ الٰہی کے تابع ہو کر رہ جاتے ہیں۔ انسان کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی آزادی یا مجبوری کے حدود کو ماپنے کی کوشش کرے یا یہ مسئلہ حل کرنے میں اپنا دماغ لڑائے کہ یہ جبر و اختیار ایک دوسرے کے ساتھ کیسے جمع ہو سکتے ہیں؟ انسان جب تک انسانی حدود میں مقید ہے اور جب تک وہ مخلوق کے بجائے خالق نہیں بن جاتا، اس وقت تک وہ اس پیچیدہ مسئلے کی تہ اور کنہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ انسان کا کام یہ ہے کہ جس حد تک اُسے آزادی دی گئی ہے اس حد تک اُسے خالق کی رضا اور منشاء کے مطابق استعمال کرے اور جن حدود سے آگے اُسے آزادی حاصل نہیں، وہاں وہ آزاد اور خود مختار ہونے کا ادعا نہ کرے۔

اس اصولی بات کو سمجھ لینے کے بعد آپ عمر کے گھٹنے اور بڑھنے کے سوال پر خود غور کریں۔ یہ بات آخر کس کو معلوم ہے کہ خدا نے کس شخص کی موت کے لیے کونسا وقت مقرر کیا تھا اور کسی خاص دور یا عہد میں کسی خاص قوم کی عمر کا اوسط اس نے کیا متعین فرمایا تھا؟ اگر اس

کا علم کسی کو نہیں ہے تو پھر یہ دعویٰ خود بخود بے معنی ہو جاتا ہے کہ خدا کے مقرر کیے ہوئے وقت پر فلاں شخص نہ مر سکا اور اس نے یا کسی دوسرے نے اس کی عمر میں اضافہ کر دیا۔ یہ سب دراصل بے عقلی کی باتیں ہیں جو بہت سے لوگ بے سمجھے بوجھے کرتے رہتے ہیں۔ ہمارا کام صرف یہ ہونا چاہیے کہ ہم کو خدا نے علم اور عقل کی جو طاقتیں دی ہیں، انہیں استعمال کر کے ہم امراض کے علاج اور صحت کی حفاظت کے زیادہ سے زیادہ بہتر ذرائع مہیا کریں اور ان کے مہیا ہو جانے پر خدا کا شکر بجا لائیں۔ اس سے آگے بڑھ کر کوئی چیز ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم نہ کسی کو بیمار پڑنے دیتے اور نہ کسی کو مرنے دیتے۔ لیکن مرض یا موت کو بالکل روک دینے پر نہ کبھی قدیم زمانے کا انسان قادر تھا، نہ آج کے زمانے کا کوئی بڑے سے بڑا معالج یا سائنٹسٹ قادر ہو سکا ہے۔

---

## ضروری اعلان

(۱) منصبِ رسالت نمبر کی چند کاپیاں دفتر ترجمان القرآن میں بچی ہوئی ہیں۔ قیمت فی کاپی ۳/۵۰ روپے ہے۔ مگر اب فی کاپی ۲ روپے مع ڈاک خرچ کے حساب سے جو اصحاب چاہیں خرید سکتے ہیں۔

(۲) ترجمان القرآن کے پرانے پرچے از جون ۴۸ء تا اکتوبر ۶۳ء دفتر میں غیر مسلسل موجود ہیں۔ ۳ر فی کاپی کے حساب سے جن اصحاب کو ضرورت ہو منگوا سکتے ہیں۔

مینجر ترجمان القرآن
اچھرہ - لاہور